ڈاکٹر حافظ محمد زبیر[1]

اجتماعی اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ

Abstract

Ijtihād refers to one's exertion in determining the Islamic legal ruling from the vastness and depths of Islamic texts, or to the application of such ruling on the subject matter.

This form of Ijtihād differs from the conventional form where such activity is carried out by an individual rather than a group of reputable academics of the relevant field collectively. In the subcontinent of Indo-Pak, Dr. Mūḥammad Iqbāl was the first one to present the idea of delegating or accrediting the responsibility of 'Ijtihād' to the parliament of the Islamic state and as a result, giving such Ijtihād the status of a statute.

However, because of the parliamentarians' lacking in credibility and capability of carrying out such research and academic activity, the application of it seems implausible. Therefore, to delegate the responsibility of Collective Ijtihād to the people who are elected merely on democratic grounds is against the very spirit of Islam. Nonetheless, the delegation of such responsibility to the committee of relevant scholarly people is appropriate; whether they operate privately or are supervised by government institutions.

پارلیمنٹ (Parliament) انگریزی زبان کا لفظ ہے اور یہ فرانسیسی لفظ "Parler" سے بنا ہے کہ جس کا معنی

1 اسسٹنٹ پروفیسر، ڈیپارٹمنٹ آف ہیومینٹیز، کامسائس انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، لاہور

بولنا، بات کرنا اور گفتگو کرنا ہے۔ تیرہویں صدی عیسوی کے آغاز میں ذمہ دار افراد کی باہمی باقاعدہ گفتگو پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا تھا۔[1] آج کل اس لفظ کا استعمال عموماً کسی خطہ ارضی میں قائم ایک ایسی مجلس یا ہیئت کے لیے ہوتا ہے جو عوام الناس کے منتخب کردہ نمائندوں پر مشتمل ہو اور ریاست کے مسائل سے بحث کرتی ہو۔ بعض ممالک میں اس کو نیشنل اسمبلی (National Assembly) یا سینٹ (Senate) کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

علامہ اقبال ؒ (متوفیٰ 1938ء) برصغیر پاک و ہند میں بالخصوص اور عالم اسلام میں بالعموم ایک مسلمان مفکر اور فلسفی کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اقبال ؒ ایک بہت بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ ان کے افکار و نظریات ان کی شاعری اور نثر دونوں اسالیب میں موجود ہیں۔ ان کی شاعری نے عامۃ الناس کو ایمان و یقین کے حقیقی جذبے سے سرشار کیا، مایوسی کو ختم کیا اور امت کے دلوں میں امید کے چراغ روشن کیے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانانِ برصغیر کی تحریک آزادی میں روح پھونک دی تھی۔ سید خالد جامعی حفظہ اللہ، ڈاکٹر اقبال ؒ کی شاعری کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں:

”واقعہ یہ ہے کہ ”اقبال کی شاعری محض شاعری نہیں صُور اسرافیل اور نغمہ جبرئیل ہے۔ یہ شاعری اذان کی طرح مشرق و مغرب کی وادیوں میں، گونج رہی ہے۔ اس شاعری نے دلوں میں ایک ایسی آگ لگادی ہے جو آج بھی بجھنے نہیں پاتی۔ اقبال کی شاعری مشرق و مغرب کی تمام اہم زبانوں کے سرچشموں سے صہبا کشید کرتے ہوئے لفظوں کا گلزار اور خوابوں کا چمن زار سجادیتی ہے۔ ان کی شاعری کا آبگینہ قوس و قزح کے رنگوں کی طرح جگمگاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے فلک سے ستارے اتار کر شعروں کی قباء میں ٹانک دیے ہیں اور لفظوں میں سیماب کی تڑپ بھر دی ہے۔“[2]

کئی ایک مفکرین اور علما، اقبال کی شاعری کو الہامی شاعری کا درجہ دیتے ہیں۔ خالد جامعی حفظہ اللہ شاعر اقبال ؒ کو ملت اسلامیہ کا سب سے بڑا مرثیہ خواں اور امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کا حدی خواں قرار دیتے ہیں۔ جامعی صاحب اقبال کی شاعری کی ہمہ جہتی صفات اور متنوع انوارات کا بڑی جامعیت کے ساتھ تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اقبال ملتِ اسلامیہ کے سب سے بڑے مرثیہ خواں اور اس کے احیاء و نشاۃ ثانیہ کے سب سے بڑے حدی خواں ہیں، مگر ان کی مرثیہ خوانی اضمحلال اور شکست کے بجائے حوصلہ، ولولہ، طنطنہ، شوکت اور جلال تخلیق کرتی ہے۔ ان کے اشعار پڑھ کر ایمان کی تجدید ہوتی ہے، دل شوقِ سفر پاتا ہے اور نگاہ ذوقِ نظر حاصل کرتی ہے۔ اقبال کی شاعری کا مرکز و محور قرآن کریم ہے جس نے انسانوں کے اس عظیم الشان قافلے کو جنم دیا جو ازل سے ابد تک کے سب سے بڑے انسان محمد عربی ﷺ کی قیادت میں کھجور کی چٹائیوں پر سوتا تھا، اینٹوں کے تکیے بناتا اور فرش

[1] Ellen Goodman, The Origins of the Western Legal Tradition: From Thales to the Tudors, The Federation Press, Sydney, 1995, p. 268

[2] خالد جامعی، سید، اَمالی ڈاکٹر غلام محمد: چند استفسارات، (ماہنامہ) ساحل، ستمبر 2006ء، کراچی، جلد 1، شمارہ 9، ص 1-2

پر لیٹ کر عرش سے ہم کلام ہوتا تھا۔ ان کی پوری شاعری اسی قافلے کی حکایت اور جستجو کا سفر ہے غزل ہو یا نظم، مثنوی ہو یا قطعہ۔ اقبال کی شاعری میں تکبیریں سانس لے رہی ہیں اور مصرعوں سے ان حدی خوانوں کے لہجے و نغمے سنائی دے رہے ہیں جن کا نورانی ذکر اب تاریخ کی زینت ہے۔ اس مقام پر ان کی آواز کسی شاعر یا فرد کی آواز بننے کے بجائے ملت اسلامیہ کی اجتماعی آواز بن جاتی ہے اور اس آواز کی بازگشت، قرطبہ سے نینوا تک، فاران سے اصفہان تک، وسط ایشیا سے کشمیر تک، مغرب کی وادیوں سے مغرب اقصیٰ کی بلندیوں تک چلی جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے مغرب اور مشرق کے تمام بڑے شعراء اور فلسفیوں سے استفادہ کیا لیکن ان کا رنگ اور آہنگ ان سب سے مختلف ہے۔ ان کی شاعری ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں شعر قال سے نکل کر حال ہو جاتا ہے اور شاعر کی زبان کا آہنگ، اس کا انداز بیاں اور پیرایۂ تعبیر سب کچھ بدل کر الہامی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔"[1]

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی اپنی فکر پیش کی ہیں۔ علامہ کی نثر میں معروف ترین کتاب 'خطبات اقبال' ہے۔ یہ کتاب علامہ کے چند خطبات پر مشتمل ہے جو انہوں نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں تیار کیے تھے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اسی دہائی میں مختلف اوقات میں مدراس، علی گڑھ اور لاہور وغیرہ میں اپنے ان خطبات کو پڑھ کر سنایا۔ ان خطبات میں ایک خطبہ "The Principle of Movement in the Structure of Islam" یعنی 'اسلام میں اصولِ حرکت کا تصور' کے نام سے ہے۔ مترجمین خطبات نے اس خطبے کو 'اجتہاد' کا عنوان دیا ہے، کیونکہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس خطبے میں 'اجتہاد' سے متعلق اپنے بعض تصورات پیش کیے ہیں۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے خطبہ 'اجتہاد' کب لکھا۔ اس بارے میں جسٹس جاوید اقبال رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 2015) فرماتے ہیں:

"سید عبدالواحد معینی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1980ء) نے خطبات کا سنِ تحریر 1920ء بتلایا ہے۔ جب کہ رشید احمد صدیقی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1977) کے نزدیک یہ 1925ء میں لکھا گیا... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے یہ مقالہ کئی سال میں لکھا۔ اس کی ایک شہادت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خط ہے جو انھوں نے اپنے دوست سعید الدین جعفری کو 3 اگست 1922ء کو لکھا۔ اس میں فرماتے ہیں: آج کل کچہری بند ہے میں ایک مفصل مضمون انگریزی میں لکھ رہا ہوں جس کا عنوان ہے: "The Idea of Ijtihad" امید ہے آپ اسے پڑھ کر خوش ہوں گے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ 1922ء میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اس مقالہ کی تیاری میں مصروف تھے۔"[2]

---

1 چند استفسارات: ص2

2 ادارہ ساحل، اقبال نے خطبہ اجتہاد کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا تھا، (ماہنامہ) ساحل، کراچی، جلد 1، شمارہ 10، اکتوبر 2006ء، ص51

ماہنامہ ساحل کی تحقیق کے مطابق 1920ء میں مقالے پر کام شروع ہوا۔ 1922ء میں اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے یہ خطبہ لکھنا شروع کیا اور تقریباً 1924ء تک مقالہ 'اجتہاد' کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ یکم دسمبر 1924ء کو یہ مقالہ اسلامیہ کالج، لاہور میں پڑھ کر سنایا گیا اور اس خطبے کے پڑھے جانے پر بعض علماء نے اقبال رحمۃ اللہ علیہ پر کفر کے فتوے بھی لگائے جو کہ قطعی طور درست نہیں تھا۔ جسٹس جاوید اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے یہ مقالہ لاہور کے ایک اجلاس میں پڑھا۔ زمیندار لاہور کی 15/دسمبر 1924ء کی اشاعت میں صفحہ تین پر ایک اشتہار شائع ہوا جس کی عبارت مندرجہ ذیل ہے:"علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا خطبہ، الاجتھاد فی الاسلام" آج شنبہ مورخہ 1/دسمبر کی شام ساڑھے چھ بجے اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں علامہ سر شیخ محمد اقبال مدظلہ العالی ایک نہایت اہم مضمون پڑھ کر سنائیں گے۔ مضمون کا موضوع الاجتہاد فی الاسلام ہو گا۔ جلسہ کی صدارت کے لئے شیخ عبدالقادر نائب صدر مجلس وضع قوانین پنجاب کا نام تجویز کیا گیا ہے۔ مضمون انگریزی زبان میں سنایا جائے گا۔ یہ مقالہ پڑھا گیا اور اس پر شدید رد عمل ہوا۔ مولوی دیدار علی نے علامہ کے کفر کا فتویٰ جاری کیا۔"[1]

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے 'خطبہ اجتہاد' میں پارلیمنٹ کے ذریعے اجتہاد کرنے کا نقطہ نظر پیش فرمایا ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ 'اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ' پر بحث سے پہلے ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ ان کے ہاں اجتہاد کی جو معنی و مفہوم پایا جاتا ہے، اس کی طرف اختصار کے ساتھ اشارہ کر دیں۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے مطبوع خطبہ اجتہاد میں 'اجتہاد' کی درج ذیل تعریف درج ہے:

"The word literally means to exert. In Islamic terminology of Islamic Law it means to exert with a view to form an independent judgement on a legal question."[2]

"لغوی اعتبار سے تو اجتہاد کے معنی ہیں کوشش کرنا، لیکن فقہ اسلامی کی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے وہ کوشش جو کسی قانونی مسئلے میں آزادانہ رائے قائم کرنے کے لیے کی جائے۔"[3]

اجتہاد کا یہ معنی و مفہوم صحیح نہیں ہے۔ اجتہاد کسی مسئلے کے بارے قرآن و سنت کی گہرائیوں اور وسعتوں میں حکم شرعی کی تلاش کا نام ہے نہ کہ قرآن و سنت کو نظر انداز کرتے ہوئے آزادانہ رائے قائم کرنے کا، جیسا کہ

1 اقبال نے خطبہ اجتہاد کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا تھا: ص 54-55

2 Iqbal, Muhammad, The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam, Iqbal Academy: Lahore, 2nd Edition, 1989, p. 117

3 اقبال، محمد، ڈاکٹر، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ: ص 222، نذیر نیازی سید (مترجم)، بزم اقبال کلب روڈ، لاہور، جنوری 2000ء

اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے۔ اسی تعریف کے زیرِ اثر ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ کا نظریہ پیش کیا۔ ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا یہ بھی ہے کہ اگر کسی مسلمان ملک کی پارلیمنٹ اتفاق رائے سے کسی مسئلے میں اپنی آزادانہ رائے کا اظہار کرتی ہے تو اسمبلی کا وہ فیصلہ اجماع (Consensus) کے قائم مقام ہو گا۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"The Ijma: The third source of Muhammadan Law is Ijma, which is, in my opinion, perhaps the most important legal notion in islam, while invoking great academic dicussions in early Islam, remained practically a mere idea, and rarely assumed the form of a pemanent institution in any muhammadan country...It is, however, extremely satisfactory to note that the pressure of new world-forces and the political experience of European nations are impressing on the mind of modren Islam the value and possibilities of the idea of Ijma. The growth of republican spirit and the gradual formation of legislative assemblies in Muslim lands constitute a great step in advance. The transfer of the power of Ijtihad from individual representatives of schools to a Muslim legislative assembly which, in view of the growth of opposing sects, is the only possible form Ijma can take in modren times, will secure constributions to legal dicussions from laymen who happen to possess a keen insight into affairs.In this way alone can we stir into activity the dormant spirit of life in our legal system, and give it an evolutionary outlook. In India, however, difficulities are likely to arise for it doubtful whether a non-Muslim legislative assembly can excercise the power of Ijtihad."[1]

"اجماع: فقہ اسلامی کا تیسرا ماٰخذ اجماع ہے اور میرے نزدیک اسلام کے قانونی تصورات میں سے زیادہ اہم، لیکن عجیب بات ہے کہ اس نہایت ہی اہم تصور پر اگرچہ صدرِ اسلام میں نظری اعتبار سے تو خوب بحثیں ہوتی رہیں، لیکن عملاً اس کی حیثیت ایک خیال سے آگے نہیں بڑھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ممالک اسلامیہ میں یہ تصور ایک مستقل ادارے کی صورت اختیار کر لیتا... بہر حال اس وقت دنیا میں جو نئی نئی قوتیں ابھر رہی ہیں، کچھ ان کے

[1] The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam: pp. 137-138

اور کچھ مغربی اقوام کے سیاسی تجربات کے پیش نظر مسلمانوں کے ذہن میں بھی اجماع کی قدر و قیمت اور اس کے مخفی امکانات کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔ بلاد اسلامیہ میں جمہوری روح کا نشوونما اور قانون ساز مجالس کا بتدریج قیام ایک بڑا ترقی زا قدم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مذاہب اربعہ کے نمائندے جو سر دست فرداً فرداً اجتہاد کا حق رکھتے ہیں، اپنا یہ حق مجالس تشریعی کو منتقل کر دیں گے۔ یوں بھی مسلمان چونکہ متعدد فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اس لیے ممکن بھی ہے تو اس وقت اجماع کی یہی شکل۔ مزید بر آں غیر علماء بھی جو ان امور میں بڑی گہری نظر رکھتے ہیں، اس میں حصہ لے سکیں گے۔ میرے نزدیک یہی ایک طریقہ ہے جس سے کام لے کر ہم زندگی کی اس روح کو جو ہمارے نظامات فقہ میں خوابیدہ ہے، از سر نو بیدار کر سکتے ہیں۔ یونہی اس کے اندر ایک ارتقائی مطمح نظر پیدا ہو گا۔ ہندوستان میں البتہ یہ امر کچھ ایسا آسان نہیں کیونکہ ایک غیر مسلم مجلس کو اجتہاد کا حق دینا شاید کسی طرح ممکن نہ ہو۔"[1]

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اجماع کی جو تعبیر بیان کی ہے وہ درست نہیں ہے۔ اجماع، مجتہدین کے اتفاق کو کہتے ہیں۔ اور یہ بات واضح ہے کہ عالمی جمہوری نظام میں انتخاب کے طریقے سے مجتہدین پارلیمنٹ میں نہیں آتے بلکہ سیاستدان آتے ہیں اور پاکستان سمیت اکثر و بیشتر ممالک میں پارلیمنٹ یا اسمبلی کا ممبر بننے کے لیے کوئی دینی تعلیمی معیار مقرر نہیں ہے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے اس نظریے پر یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ اگر کسی مسلمان ملک میں اجتہاد کا اختیار پارلیمنٹ کو دے دیا جائے تو پارلیمنٹ میں عوام الناس کے جو نمائندہ ہوتے ہیں وہ اجتہادی صلاحیت تو کجا، دین کی بنیادی تعلیمات سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے خود بھی اس سوال کی نزاکت کو محسوس کر لیا تھا۔ انہوں نے اپنے خطبے میں اس سوال کو اٹھایا تو ہے لیکن اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ وہ فرماتے ہیں:

"One more question may be asked as to the legislative activity of a modern Muslim assembly which must consist, at least for the present' mostly of men possessing no knowledge of the subtleties of Muhammadan Law. Such an assembly may make grave mistakes in their interpretaion of law. How can we exclude or at least reduce the possibilities of erroneous interpretation? The persian constitution of 1906 provided a separate ecclesiastical committee of Ulema- conversant with the affairs of the world - having power to supervise the legislative

[1] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ: ص 248-249

activity of the Mejliss. This, in my opinion, dangerrous arrangement is probably necessary in view of the Persian constitutional theory...But whatever may be the persian constitutional, the arrangement is not free from danger, and may be tried' if at all, only as a temporary measure in Sunni countries. The Ulema should form a vital part of a Muslim legislative assembly helping and guiding free discussion on questions relating to law. The only effective remedy for the possibilities of erroneous interpretations is to reform the present system of legal education in Muhammadan countries, to extend its sphere, and to combine it with an intelligent study of modren jurisprudence."[1]

"لیکن ابھی ایک اور سوال ہے جو اس سلسلے میں کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ موجودہ زمانے میں تو جہاں کہیں مسلمانوں کی کوئی قانون ساز مجلس قائم ہو گی اس کے ارکان زیادہ تر وہی لوگ ہوں گے جو فقہ اسلامی کی نزاکتوں سے ناواقف ہیں۔ لہٰذا اس کا طریق کار کیا ہو گا کیونکہ اس قسم کی مجالس، شریعت کی تعبیر میں بڑی بڑی شدید غلطیاں کر سکتی ہیں۔ ان غلطیوں کے ازالے یا کم سے کم امکان کی صورت کیا ہو گی؟ 1906ء کے ایرانی دستور میں تو اس امر کی گنجائش رکھ لی گئی ہے کہ جہاں تک امور دینی کا تعلق ہے، ایسے علماء کی جو معاملات دنیوی سے بھی خوب واقف ہیں ایک الگ مجلس قائم کر دی جائے تا کہ وہ مجلس کی سرگرمیوں پر نظر رکھے۔ یہ چیز بجائے خود بڑی خطرناک ہے، لیکن ایرانی نظریہ دستور کا تقاضا کچھ ایسا ہی تھا... بہر حال ایرانی نظریہ دستور کچھ بھی ہو یہ انتظام بڑا خطرناک ہے، اور سنی ممالک اسے اختیار بھی کریں تو عارضی طور پر۔ انہیں چاہیے مجالس قانون ساز میں علماء کو بطور ایک موثر جزو شامل تو کر لیں لیکن علماء بھی ہر امر قانونی میں آزادانہ بحث و تمحیص اور اظہار رائے کی اجازت دیتے ہوئے اس کی رہنمائی کریں۔"[2]

'خطباتِ اقبال' اور جدیدیت

بعض علمی حلقوں کا خیال ہے کہ مسلمان ممالک میں جدیدیت کی تحریک نے علامہ اقبال رحمہ اللہ کے خطبات کو ایک انجیل کا درجہ دے دیا ہے، حالانکہ اس کی علمی حیثیت ایک مذہبی نقطہ نظر سے زیادہ نہیں تھی۔ ماہنامہ ساحل کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

1 The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam: pp. 139-140

2 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ: ص 251

”جدیدیت پسند طبقات کے لیے خطبات 'جدیدیت کی انجیل' کا درجہ رکھتے تھے، لہٰذا خطبات میں حضرت اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے طالب علمانہ موقف سے اسلام، سنت، امت، علماء اور اجماع کو رد کرنے کے لیے موشگافیاں ڈھونڈی گئیں۔ حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ جو تمام زندگی خود کو دین کا طالب علم لکھتے سمجھتے رہے اور آخر تک علماء کرام سے مستقل اور مسلسل استفادہ فرماتے رہے، انھیں جدیدیت پسند حلقوں نے دین کے بہت بڑے عالم کے روپ میں پیش کرنا شروع کیا تاکہ حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم الشان اور نادر الوجود شخصیت کے سحر سے اسلامی عقائد، عبادات، تاریخ اور امت کے اجماع کو تہس نہس کیا جاسکے۔ جدیدیت پسندوں کے پاس پوری اسلامی تاریخ سے جدیدیت پسندی کے حق میں دو چار دلائل اگر مل سکتے ہیں تو وہ معتزلہ کے افکار و نظریات ہیں یا خطبات اقبال کی عبارتیں۔ مغرب کے الحاد اور مغرب کی الحادی سائنس و ٹیکنالوجی کے جواز میں ان دو اہم حوالوں کے سوا جدیدیت پسندوں کے پاس اپنے حق میں کہنے کے لیے کچھ نہیں۔“[1]

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے تصورِ اجتہاد کو بنیاد بناتے ہوئے ان کے بیٹے ڈاکٹر جاوید اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا یہ ہے کہ آج کے دور میں عورتوں کو بھی مردوں کے برابر وراثت میں حصہ ملنا چاہیے جبکہ قرآن مجید کی قطعی نصوص اس کے خلاف ہیں۔

'خطباتِ اقبال' علماء کی نظر میں

اہل علم کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات میں بالعموم اور خطبہ اجتہاد میں بالخصوص چند ایک ایسے افکار موجود ہیں جو کتاب و سنت کی قطعی نصوص اور امت مسلمہ کے متفق علیہ عقائد سے متصادم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان خطبات کو پیش کرنے کے ساتھ ہی علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ پر علماء کی جانب سے استفسارات، اعتراضات، اشکالات اور فتاویٰ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے بعض خطوط سے بھی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس مقالے کے پڑھے جانے پر ان پر کفر کا فتویٰ بھی لگایا گیا تھا جو کہ بہت ہی افسوس ناک معاملہ ہے۔ جسٹس جاوید اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”اس سلسلے میں سب سے قوی شہادت تو خود علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا خط ہے جو انھوں نے مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1938ء) کو لکھا۔ کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک انگریزی مضمون لکھا تھا جو یہاں ایک جلسے میں پڑھا گیا، انشاء اللہ شائع بھی ہو گا۔ مگر بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا۔ بہر حال اس تمام معاملے کے متعلق مفصل گفتگو ہو گی جب آپ لاہور تشریف لائیں گے....“[2]

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات میں پیش کردہ افکار پر ان کی تکفیر کا معاملہ ان کی وفات کے بعد بھی جاری

1 آمالی ڈاکٹر غلام محمد: چند استفسارات: ص3
2 اقبال نے خطبہ اجتہاد کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا تھا: ص55

رہا۔ ماہنامہ ساحل کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"جامعہ ام القریٰ سے ڈاکٹریٹ کا مقالہ" محمد إقبال وموقفه من الحضارة الغربية... الدكتور خليل الرحمان" 1988ء میں شائع ہوا جس کی بنیاد پر عرب علماء نے اقبال کے کفر کے فتوے دیے اور جاوید اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے بقول سعودی عرب میں ایک کانفرنس بھی علماء کی منعقد ہوئی۔"[1]

ڈاکٹر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ پر کفر کا فتویٰ لگانا تو کسی طور درست نہیں تھا لیکن برصغیر پاک و ہند کے جلیل القدر علماء نے خطباتِ اقبال کو اسلام کے بنیادی اور اتفاقی نظریات سے متصادم قرار دیا اور ان کی اشاعت ناپسند فرمایا۔ سلیم احمد صاحب لکھتے ہیں:

"اقبال سے جن لوگوں نے اختلاف کیا ہے ان میں مولانا اکبر الہ آبادی (متوفیٰ 1938ء)، سید سلیمان ندوی (متوفیٰ 1953ء)، مولانا عبد الماجد دریابادی (متوفیٰ 1977ء)، خواجہ حسن نظامی (1955ء) اور مولانا مودودی (متوفیٰ 1979ء) رحمۃ اللہ علیہم جیسی جید شخصیتیں شامل ہیں۔ اختلافات کا یہ سلسلہ اتنا پھیلا ہوا ہے کہ اخبار 'جسارت' کی رپورٹ کے مطابق مکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور دیگر اساتذہ نے اقبال پر الحاد و زندقہ کے الزام لگائے ہیں اور سفارش کی ہے کہ اقبال کے خطبات کو نوجوانوں تک پہنچنے سے روکا جائے کیونکہ اس سے نئی نسل کے گمراہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ یہ رپورٹ 'جسارت' میں 'پرستارانِ اقبال کے لیے ایک لمحہ فکریہ' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔ خود اقبال کا حال یہ تھا کہ بقول نذیر نیازی جیسے اقبالی کے، جب انھوں نے اقبال سے خطبات کے بعض مقامات کی وضاحت چاہی تو علامہ یہ کہہ کر بری الذمہ ہو گئے کہ بعض اوقات میری کیفیت ایسی ہوتی ہے کہ مجھے خود بھی نہیں معلوم ہوتا کہ میں کیا کہہ گیا ہوں۔ شاعری میں خدا کو بخیلی کا طعنہ دینا، ہرجائی کہنا، نیاز مند اور گرفتار آرزو کہنا یہ سب تو شاعرانہ باتیں تسلیم کی جاسکتی ہیں لیکن نثر میں مجذوب بن جانے کا کیا جواز ہے؟"[2]

جسٹس جاوید اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کے مطابق خطبات کے اردو ترجمہ کی اشاعت میں تاخیر کی وجہ ہی یہی تھی کہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو پہلے سے ہی یہ اندیشہ تھا کہ ان خطبات کی اشاعت پر علماء کے حلقے کی طرف سے شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جسٹس جاوید اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اور تیسری بات یہ ہے کہ اس کتاب سے علماء بہت ناراض تھے بلکہ اس کا اردو ترجمہ کرنے میں بھی اگر تساہل ہوا تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اگر اس کا اردو ترجمہ ہوا تو ممکن ہے علامہ اقبال پر علماء اعتراض کریں جیسے کہ یہ اکبر کی طرح کا کوئی دینِ الٰہی یا کوئی نیا مذہب یا مذہب کی کوئی نئی تاویل پیش کرنے کی کوشش ہو۔ چنانچہ اس پر اعتراضات بھی ہوئے۔"[3]

---

1 اقبال نے خطبہ اجتہاد کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا تھا: ص 12
2 أیضاً: ص 10
3 أیضاً: ص 37

اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ جناب سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1953ء) کو خطبات کی اشاعت پسند نہ تھی۔ جسٹس جاوید اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو خطبات کی اشاعت پسند نہ تھی۔ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے کہا کہ اس کتاب کو شائع نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔"[1]

ماہرینِ اقبالیات اس بات کو ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ سید صاحب کو 'خطبات' کی اشاعت ناپسند تھی۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1999ء) کے بیان کے مطابق بھی سید صاحب نے 'خطبات' کی اشاعت کو ناپسند فرمایا تھا۔ مولانا أبو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"ان کے مدراس کے خطبات جو انگریزی میں Reconstruction of Religions Thought in Islam" کے نام سے شائع ہوئے اور ان کا اردو اور عربی میں ترجمہ بھی ہوا ہے، بہت سے ایسے خیالات و افکار ملتے ہیں جن کی تاویل، توجیہہ اور اہلِ سنت کے اجماعی عقائد سے مطابقت مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے یہی احساس، استاذِ محترم مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، ان کی تمنا تھی یہ لیکچر شائع نہ ہوئے ہوتے تو اچھا تھا۔"[2]

مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1999ء) کی اس تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد ظفر اقبال لکھتے ہیں:

"مولانا سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی کسی تحریر کے سوا کورہ بیان سے زیادہ اور کوئی محکم ذریعہ نہیں ہے، جس سے مولانا سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کا علم ہو سکے، اب دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں یا تو اسے تسلیم کر لیا جائے یا مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف کذب و خیانت کی نسبت کی جائے۔"[3]

مولانا أبو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے خیال میں اقبال کے خطبات میں پیش کردہ بعض نظریات امت مسلمہ کے اجماعی عقائد سے متضاد و متصادم ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"میں اقبال کو کوئی معصوم و مقدس ہستی اور کوئی دینی پیشوا اور امام مجتہد نہیں سمجھتا اور نہ ہی ان کے کلام سے استناد اور مدح سرائی میں حدِ افراط کو پہنچا ہوا ہوں، جیسا کہ ان کے غالی معتقدین کا شیوہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حکیم سنائی، عطار اور عارف رُومی، آدابِ شریعت کے پاس اور لحاظ، ظاہر و باطن کی یک رنگی اور دعوت و عمل کی ہم آہنگی میں ان سے بہت آگے ہیں۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں اسلامی عقیدہ و فلسفہ کی ایسی تعبیریں بھی ملتی ہیں، جن سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ میں بعض پُرجوش نوجوانوں کی طرح اس کا بھی قائل نہیں کہ اسلام کو اُن سے بہتر کسی نے سمجھا ہی نہیں اور اس کے علوم و حقائق تک ان کے سوا کوئی پہنچا ہی نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اپنے مقتدر

---

1 اقبال نے خطبہ اجتہاد کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا تھا: ص39

2 ظفر اقبال، محمد، ساحل کے مباحث پر نقد، (ماہنامہ) ساحل، کراچی، جلد 1، شمارہ 11، نومبر 2006ء، ص84

3 أیضاً

معاصرین سے برابر استفادہ ہی کرتے رہے۔ اُن کی نادر شخصیت میں بعض ایسے کمزور پہلو بھی ہیں جو اُن کے علم وفن اور پیغام کی عظمت سے میل نہیں کھاتے اور جنھیں دُور کرنے کا موقع انھیں نہیں ملا۔ ان کے مدراس کے خطبات میں بہت سے ایسے خیالات و افکار بھی ہیں جن کی تعبیر وتوجیہہ اور اہلِ سُنّت کے اجتماعی عقائد سے مطابقت مشکل ہی سے کی جاسکتی... یہ لیکچر شائع نہ ہوئے ہوتے تو اچھا تھا۔"[1]

ڈاکٹر محمد خالد مسعود کے بقول بھی علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے نقطہ نظر 'اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ' کو علماء میں قبول عام حاصل نہ ہو سکا اور علماء نے عموماً پارلیمنٹ کی بجائے غیر سرکاری اداروں اور انجمنوں کے ذریعے ہی اجتماعی اجتہاد کے عمل کو آگے بڑھانے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ ڈاکٹر خالد مسعود لکھتے ہیں:

"اجماع اور اجتہاد کے بارے میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ایک طرح سے دو اجتہادات پیش کیے تھے۔ ایک تو اجتہاد کے انفرادی کے بجائے اجتماعی عمل کا تصور، دوسرے قانون ساز اسمبلیوں سے اجماع اور اجتہاد یا اجتماعی اجتہاد کے اداروں کا کام لینے کی تجویز۔ ان میں پہلی بات تو علماء میں خاصی مقبول ہوئی اور بہت سے علماء کے ہاں اس کی تائید ملتی ہے۔ اگرچہ اس میں براہ راست اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے بات نہیں کی گئی، تاہم پاکستان سے مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1977ء) اور بھارت سے مولانا تقی امینی نے بہت زور کے ساتھ انفرادی کی بجائے اجتماعی اجتہاد پر زور دیا ہے۔ دوسرے ممالک میں بھی اس خیال کو حمایت حاصل ہوئی۔ چنانچہ شیخ اَبو زہرہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1974ء) (الاجتہاد فی الفقہ الإسلامی)، مصطفی احمد زرقاء رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1999ء) (الاجتہاد ومجال التشریع فی الإسلام) اور شیخ عبد القادر المغربی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1956ء) نے (البینات) میں بہت زور دیا۔ البتہ اجتماعی اجتہاد کی شکلیں کیا ہوں گی، اس پر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے خیال کو قبول عام حاصل نہ ہو سکا۔ اکثر علماء نے جن میں اَبو زہرہ اور مصطفی زرقاء رحمۃ اللہ علیہم بھی شامل ہیں، علماء کی خصوصی مجالس اور تحقیقاتی اداروں کی تشکیل کی تجاویز دی ہیں، لیکن یہ اختیارات قانون ساز اسمبلیوں کو دینے کی تائید علماء کی جانب سے ابھی تک نہیں ہوئی۔"[2]

خطبہ اجتہاد اور علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید

ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ جناب سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے خطبہ اجتہاد پر بہت کڑی تنقید کی ہے۔ سید صاحب نے اپنی زندگی میں ہی ڈاکٹر غلام محمد صاحب کو اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات کے حوالے سے کچھ تنقیدی تحریریں املاء کروائیں تھیں۔ سید صاحب کی یہ تحریریں ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکیں بلکہ اس تنقید کو پہلی

---

1 جاوید اقبال، جسٹس، علماء کے خوف سے خطبات کا اردو ترجمہ نہیں کیا گیا، (ماہنامہ) ساحل، کراچی، ج 1، شمارہ 10، اکتوبر 2006ء، ص 39

2 غلام محمد، ڈاکٹر (املی)، خطبات اقبال کا ناقدانہ جائزہ، (سہ ماہی) اجتہاد، اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد، جلد 1، شمارہ 1، جون 2007ء، ص 45-46

مرتبہ ماہنامہ ساحل نے جون 2006ء کے شمارے میں 'امالی ڈاکٹر غلام محمد' کے نام سے شائع کیا ہے۔ بعض ماہرینِ اقبال کا خیال ہے کہ ان 'امالی' کی سید صاحب کی طرف نسبت مشکوک ہے۔ بہر حال یہ امالی سید صاحب کے ہوں یا نہ ہوں، امر واقعہ یہ ہے کہ اِنہوں نے ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے فکر و نظر کے تار و بود بکھیر دیے ہیں۔ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

"قدیم علماء نے اجتہاد کے لیے جو شرائط طے کیں، وہ اقبال مرحوم کو عصر حاضر کے کسی فرد میں نظر نہ آئیں، تو انہوں نے اجتماعی اجتہاد اسمبلی کے ذریعے کرنے کا اجتہاد فرمایا، جب شرائط اجتہاد فرد میں نہیں پائی گئیں تو اسمبلی میں کیسے اکٹھی ہو سکتی ہیں، سو صفر اکٹھے ہو کر ایک کیسے بن سکتے ہیں، اسمبلیوں کے انتخابات کا تماشہ ہندوستان میں بہت دیکھا جا چکا، یہ اسمبلیاں کیسے اجتہاد کر سکتی ہیں؟ اسمبلی کے انتخابات کی بنیاد مساوات کے نظریے پر ہے، تمام انسان برابر ہیں، ایک زمانہ تھا جب ہند میں صرف ٹیکس دینے والے ووٹ دے سکتے تھے، وہ زمانہ بھی ختم ہو گیا، ہم پاکستان کی اسمبلی کو اجتہاد کے قابل نہیں سمجھتے، اس کے اراکین کا دینی علوم سے کیا تعلق۔ ایک آدھ استثناء چھوڑ دیجئے۔ اب علامہ اقبال مرحوم اور ایک بقال (سبزی فروش) کا ووٹ برابر ہے اور دونوں یکساں طور پر جمہوری عمل کے ذریعے اسمبلی کے ممبر بن سکتے ہیں، اب بقال، حمال، حجام اور موچی اجتہاد کریں گے، اقبال مرحوم کا یہ نقطہ نظر ان کی سطحیت کو واضح کرتا ہے، اس سطحیت کا احساس انہیں آہستہ آہستہ ہوتا گیا، کیونکہ شروع میں خطبات پر علی گڑھ میں بہت داد ملی اور ہندوستان کے پڑھے لکھے جو مغرب سے مرعوب تھے، انہیں اقبال مرحوم کے ذریعے اسلام کی فصیل میں نقب لگانے کا زبردست طریقہ مل گیا تھا لیکن جب گرد بیٹھ گئی تو حقیقت بھی کھل گئی۔"[1]

ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے خطبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا (متوفیٰ 1930) کی اصلاحات سے بہت متاثر تھے اور اپنے مقالہ اجتہاد میں جا بجا ان کی اجتہادی بصیرت کو داد دیتے نظر آتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"انتہاء یہ ہے کہ وہ ترکی کی اصلاحات کو بھی اجتہاد کے احیاء کی نئی شکلیں قرار دیتے ہیں اور ان شکلوں کی بنیاد پر یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلامی ثقافت اپنی اصل میں حرکت پذیر ہے اور اس حرکت کے لیے قوت نمو اسے خارج سے نہیں داخل سے فراہم ہوتی ہے، آج اقبال مرحوم زندہ ہوتے تو اپنے ان مفروضوں کی حقیقت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے، ان کی نظر سے کمال اتاترک کے کمالات نہیں گزرے، جب وہ آسمان کی طرف مُکا اٹھا کر اللہ کو دکھاتا ہے۔ اگر اسلام ایسے اجتہاد کے لیے آیا تھا تو پھر اسلام کی کیا ضرورت ہے؟"[2]

1 خطبات اقبال کا ناقدانہ جائزہ: ص 55
2 ایضاً: ص 55

سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا نظریہ اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ، ترک پارلیمنٹ کو سامنے رکھتے ہوئے مرتب کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"اگر ایسا کوئی مجتہد پیدا ہو جائے تو وہ ضرور اجتہاد کرے لیکن ترکی کے کمال مصطفی اتاترک اور ترکی کی پارلیمنٹ جیسے کافرانہ، ملحدانہ اداروں سے اجتہاد کی توقع کرنا اقبال مرحوم کی فاش غلطی تھی۔ اقبال مرحوم نے نثر اور شاعری کے اشارات میں ان مجتہدین عصر پر لطیف طنز کیا ہے، جو علوم نقلیہ میں رسوخ اور رسوخ فی الدین کے بغیر اجتہاد کے علمبردار بن گئے ہیں۔ لیکن ان کی مذمت کرتے ہوئے اقبال مرحوم خود اپنے مقام کا جائزہ نہیں لیتے کہ کیا وہ ان مباحث کو برپا کرنے کے اہل تھے، عربی زبان سے واقفیت کے بغیر اور علوم اسلامی میں رسوخ کے بغیر ایک ایسے منصب پر فائز ہونے کی کوشش، جہاں سے وہ ملت اسلامیہ کی تشکیل نو کا فریضہ بھی سنبھال لیتے ہیں اور اجتہاد کا طریقہ کار بھی خود طے کر لیتے ہیں۔"[1]

احمد جاوید صاحب مذکورہ بالا اشکال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ریاستی سطح پر قانون سازی کا یہ عمل ظاہر ہے کچھ اداروں ہی کی طرف سے ہو گا۔ اقبال کی نظر میں وہ ادارہ پارلیمنٹ ہے۔ اب اگر پارلیمنٹ، علم، مزاج اور کردار کے دینی معیارات پر پوری نہیں اترتی، تو پارلیمنٹ کو درست کرنا چاہیے، اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی اس تجویز پر جرح کرنے سے کیا حاصل؟"[2]

اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات کے مصادر و مراجع اور ان کی علمی منہج پر بھی سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے نقد کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"اقبال مرحوم کا فقہ اسلامی پر نقد مستشرقین (Orientalists) کے زیر اثر بہت پیچیدہ اور گنجلک ہو جاتا ہے اور اکثر مقامات پر وہ انہی کی بات اپنے نام سے کرتے ہیں، ان کا یہ کہنا کہ مالکی شافعی فقہاء حقیقت پسند تھے، جب کہ حنفی فقہ تخیلاتی اور کلامی مباحث کا مجموعہ ہے، نہایت غیر علمی اور نہایت سطحی بات ہے۔ اصلاً وہ فقہ اسلامی کے قیمتی ذخیرے سے ناواقف تھے، ان پر ان کی گہری نظر نہ تھی، چند اہم مشہور کتابیں انہوں نے مترجم کے ذریعے پڑھ ڈالیں اور اس کمزور مطالعے کے بل پر لامحدود دعوے کر دیے، اس میں ان کا اخلاص موجود ہے لیکن اخلاص علم کا متبادل نہیں ہو سکتا... اقبال مرحوم کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ مختلف متحارب مکاتب فکر اور گروہوں کے لوگوں سے خط و کتابت کرتے تھے اور اس خط و کتابت سے حاصل شدہ معلومات کے تبادلے سے کچھ مفروضات قائم کر کے اپنی ذہانت سے بعض غیر معمولی نتائج اخذ کر لیتے، ان میں وہ علمی اہلیت نہیں تھی کہ ان نکات کی تائید و تصدیق متعلقہ کتب سے براہ راست کر سکتے، وہ علم کی بجائے تعقلی وجدان کے سہارے دین پر

1 خطبات اقبال کا ناقدانہ جائزہ: ص 54
2 ایضاً: ص 67

نقد کرتے تھے۔"[1]

سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ، ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کے عنوان کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان کے بقول یہ عنوان ہی سرے سے غلط تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"اقبال مرحوم نے خطبات کا نام "Re-Construction" رکھا، مجھے اس پر بھی اعتراض تھا، تعمیر نو یا تشکیل نو کا کیا مطلب؟ کیا عمارت منہدم ہو گئی۔ تشکیل نو کا مطلب دین کی از سر نو تعمیر کے سوا کیا ہے یعنی اسلام کی اصل شکل مسخ ہو گئی۔ اب اسے از سر نو تعمیر کیا جائے۔ یہ دعوی پوری اسلامی تاریخ کو مسترد کرنے کے سوا کیا ہے؟ ان امور میں اقبال مرحوم مغرب سے اس قدر متاثر ہیں کہ اسلامی دنیا کو تیزی سے روحانی طور پر مغرب کی طرف بڑھتا ہوا دیکھتے ہیں۔"[2]

سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ' ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے پارلیمنٹ کے اجتہاد کو اجماع کے قائم مقام قرار دینے پر بھی سخت نقد کرتے ہیں اور اس کو اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بہت بڑی غلطی قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

" اجماع جمہور کو جمہوریت اور پارلیمنٹ کی اصطلاحات کے مساوی قرار دینا علوم اسلامیہ کی تاریخ سے کامل ناواقفیت کا اظہار ہے۔ یہ بھی خلط مبحث ہے، اسلام میں اجماع جہلاء کا نہیں ہے۔ اجماع، علماء کا معتبر ہے عوام کا نہیں۔ یہ علما کون لوگ ہوں گے، اس کے بھی اصول طے ہیں... اجماع کو لادینی سیاسی نظام کے جمہوری ادارے پارلیمنٹ کا متبادل سمجھنا اقبال کی بہت بڑی غلطی تھی۔ آج وہ زندہ ہوتے تو اس خیال سے رجوع کرتے۔"[3]

ایک اور مقام پر سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ، اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے اس نقطہ نظر کے تانے بانے کو مغربی فکر سے جوڑتے ہوئے کہتے ہیں:

"مغرب سے مغلوبیت نے اقبال مرحوم کو یہ باطل خیال پیش کرنے پر مجبور کیا کہ اسلامی قانون کی روح جمہوری ہے، جمہور اور اجماع کی اصطلاحات سے یہ نتیجہ اخذ کر بیٹھے کہ نئے مسائل پیش آنے پر جمہوری طریقے سے لوگوں کی رائے لے کر (ریفرنڈم وغیرہ) قانون وضع کر لیا جائے گا اور غالباً اسمبلی ان کی نظر میں اجماع اور جمہور کا متبادل تھا۔ فقہ اسلامی میں جمہور سے کیا عوام الناس مراد ہیں، اقبال مرحوم اس اصول سے تو آگاہ ہوں گے لیکن اس کی تفہیم انہوں نے مغربی منہاج میں کی تو یہ گمراہی خود بخود پیدا ہو گئی اور اقبال مرحوم کے ہاں ایسی بے شمار گمراہیاں ملیں گی۔"[4]

سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ان امالی کی اشاعت پر ماہرین اقبالیات کی طرف سے اعتراض وارد کیا گیا ہے کہ اگر

---

1 خطبات اقبال کا ناقدانہ جائزہ: ص58

2 ایضاً: ص62

3 ایضاً: ص60-61

4 ایضاً: ص57

تو یہ واقعتاً سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کے ہیں تو انہوں نے ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں ان کا اظہار کیوں نہیں کیا۔ اس بارے سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> ”دینی علوم سے کامل بے خبری اور اسلامی فقہ کے عظیم الشان ذخیرے اور علم التفسیر اور علم الحدیث کے اصولوں سے عدم واقفیت کے باعث اقبال مرحوم کے یہاں گمراہیوں کا ایک طویل سلسلہ در آتا ہے، معارف میں عموماً ان گمراہیوں پر سکوت کا ایک سبب یہ تھا کہ اقبال مرحوم کی ذات سے اور ان کے شاعرانہ کمالات سے ملت کو جو فائدہ پہنچ رہا ہے، اس میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ مولانا ماجد رحمۃ اللہ علیہ تو اس معاملے میں بہت غیرت مند تھے اور چاہتے تھے کہ اقبال مرحوم کے کفر کے خلاف جو کچھ لاوا ان کے دل میں ہے کتابی صورت میں تحریر کر دیں لیکن ان کو قائل کرنا پڑا کہ صبر سے کام لیں۔ اقبال مرحوم ملت کا اثاثہ ہیں، ان کی شاعری نے زخموں کی رفوگری کی۔ کہیں ملت سے اس کا روحانی سہارا چھن نہ پائے بلکہ انہیں آمادہ کیا کہ وہ تحریریں بھی شائع نہ کریں، جو اقبال مرحوم کے نام جارحانہ لب ولہجہ میں لکھی گئی تھیں۔“[1]

امالی غلام محمد کی صحتِ سند اور ماہرینِ اقبال کی تحقیق

ماہنامہ 'ساحل' کراچی نے جون، ستمبر، اکتوبر اور نومبر 2006ء کے شماروں میں 'خطباتِ اقبال کا ایک تحقیقی و تجزیاتی جائزہ پیش فرمایا ہے۔ ماہنامہ 'ساحل' کے اس مفصل نقد میں خطباتِ اقبال کے حوالے سے بیسوں اعتراضات اور استفسارات پیش کیے گئے۔ اقبال اکیڈمی، لاہور کی جانب سے اگرچہ اس نقد کے بعض پہلوؤں کے جواب بھی دیے گئے ہیں لیکن یہ جواب کئی اعتبارات سے کمزوری اور نقص کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ اقبال اکیڈمی کی طرف سے کیے جانے والے دفاع میں 'ساحل' کے اکثر و بیشتر اعتراضات کا جواب ہی نہیں دیا گیا اور جن اشکالات کا جواب مرتب کیا بھی گیا تو ان میں بھی یا تو صورت حال یہ ہوتی ہے کہ اقبال اکیڈمی کے مفکرین، ماہنامہ 'ساحل' کے تو خلاف ہوتے ہیں لیکن اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے دفاع میں باہم متضاد بیانات کے حامل ہوتے ہیں۔ بعض مفکرین، ماہنامہ 'ساحل' کے اعتراضات کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے ان کی تائید کرتے نظر آتے ہیں جبکہ کچھ پھر بھی ماہنامہ 'ساحل' کے مخالف ہی ہوتے ہیں اور پھر ماہنامہ 'ساحل' کے محققین، ان مفکرین کے جواب میں جواب الجواب کی طویل مشق کرتے نظر آتے ہیں۔

ماہنامہ 'ساحل' میں اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات پر جو مفصل نقد پیش کی گئی ہے، اس میں مرکزی مضمون اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ جناب سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ یہ تحقیقی مقالہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے جناب ڈاکٹر غلام محمد کو املاء کروایا تھا، جسے ان کی وفات کی بعد حال ہی میں پہلی مرتبہ ماہنامہ 'ساحل' نے 'امالی غلام محمد' کے نام

1 خطبات اقبال کا ناقدانہ جائزہ: ص59

سے شائع کیا ہے۔ اقبال اکیڈمی کے بعض مفکرین نے ان امالی کی جناب سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف نسبت کو مشکوک قرار دیا ہے لیکن ان کے پاس اپنے شک کے ثبوت میں کوئی واضح و صریح دلیل نہیں ہے۔ علاوہ ازیں امالی کے بارے میں ان مفکرین کے بیانات بھی باہم متضاد ہیں۔ ماہنامہ ساحل کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر وحید عشرت انہیں احمد جاوید کے امالی قرار دیتے ہیں۔ جاوید احمد انہیں غلام محمد کے امالی تسلیم کرتے ہیں۔ سہیل عمر کا پہلا موقف یہ تھا کہ مجھے اطمینان ہوا کہ میرے سوا اور لوگ بھی خطبات کے بارے میں اس طرح سوچتے ہیں، حیرت ہوئی کہ اس زمانے میں بھی لوگ اسی طرح سوچ سکتے تھے۔ اب ان کا موقف ہے کہ یہ امالی مرتب کی اختراع ہے۔"[1]

ان امالی کی نسبت اگر سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف ثابت نہ بھی ہو سکے تو پھر بھی ان امالی میں خطبات پر کیے گئے نقد کی قدر و قیمت کم ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے مجلہ سہ ماہی 'اجتہاد' کے مدیر لکھتے ہیں:

"اس سے قطع نظر کہ اس تحریر میں مذکور آراء سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہیں یا نہیں، یہ تحریر اپنی جگہ بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے خطبہ اجتہاد میں مذکور مسائل کے ساتھ ساتھ ان کے مراجع و مصادر پر بھی بہت قیمتی نقد موجود ہے۔"[2]

اجتماعی اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ: مختلف مکاتب فکر کے علماء کی نظر میں

معاصر دیوبندی اور اہل حدیث مکاتب فکر کے اہل علم نے اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ کے نقطہ نظر کی شد و مد سے مخالفت کی ہے۔ مولانا حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ فرماتے ہیں:

"بعض لوگ پارلیمنٹ کو یہ حق دینا چاہتے ہیں، پچھلے دنوں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے اس تجویز کو بڑا اچھالا گیا تھا کہ اجتہاد کا حق پارلیمنٹ کو حاصل ہونا چاہیے۔ لیکن یہ ایک بالکل فضول تجویز ہے۔"[3]

اسی طرح جسٹس (ر) مفتی تقی عثمانی، اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ کے بارے فرماتے ہیں:

"ہمارے ہاں ایک اور غلط فکر جسے بعض مصنفین نے نمایاں کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اجتہاد کا حق پارلیمنٹ کو تفویض کر دیا جائے۔ اس فکر کے حاملین کا کہنا یہ ہے کہ جس پر پارلیمنٹ کا اتفاق ہو جائے وہ کسی بھی جدید مسئلے کو حل کرنے کا بہترین طریقہ ہے کیونکہ پارلیمنٹ کے اراکین کو عامۃ الناس اسی مقصد کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ یہ فکر، معنی اجتہاد اور اس کے حقیقی مقتضیات سے جہالت یا تجاہل پر مبنی ہے۔ شریعت اسلامیہ میں اجتہاد محض عقلی رائے یا فیصلے کا نام نہیں ہے بلکہ اجتہاد سے مراد قرآن و سنت کی بنیاد پر شرعی حکم معلوم کرنے کی جدوجہد

---

1 اداریہ ساحل، امالی غلام محمد: اقبال اکادمی کی نقد، (ماہنامہ) ساحل، کراچی، جلد اول، شمارہ نو، ستمبر 2006ء، ص 'ب'

2 خطبات اقبال کا ناقدانہ جائزہ: ص 53

3 متین ہاشمی، محمد، سید، اجتہاد علماء کی نظر میں (سوالات و جوابات)، (سہ ماہی) منہاج، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، جلد 1، شمارہ 1، جنوری 1983ء، ص 287

ہے۔اور اس مقام و مرتبے کے لیے تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ وغیرہ جیسے علوم میں پختگی ضروری ہے اور ان علوم میں رسوخ ہر ایرے غیرے کو حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ شخص جو دوسرے علوم میں تو ماہر ہو لیکن اس نے علوم شرعیہ کو ان کے بنیادی مصادر سے نہ سیکھا ہو، اس کے لیے بھی ان دینی علوم کی خدمت کرنا ممکن نہیں ہے۔ آج کل پارلیمنٹ کے اراکین اپنے دینی علم یا علوم شرعیہ میں رسوخ کی بنیاد پر منتخب نہیں کیے جاتے۔ پس پارلیمنٹ کے ان اراکین کو اجتہاد کا فریضہ سونپنا، ان کو تکلیف مالا یطاق کا حامل بنانا ہے اور ایک اہم دینی فریضے کو نااہل لوگوں کے سپرد کرنا ہے۔"[1]

خطباتِ اقبال کا اسلوبِ بیان

خطبات پر ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ ان کی زبان ایسی مشکل ہے کہ عوام تو کجا خواص بھی اس کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ماہنامہ 'ساحل' کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"یہ بھی افسانہ ہے کہ خطبات نئی نسل کی سمجھ میں نہیں آتے۔ خود جاوید اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے زندہ رود میں لکھا ہے کہ اس کی زبان عسیر الفہم ہے اور بار بار تعاقب کے باوجود کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کئی مقامات پر انگریزی زبان میں استدلال ناقابل فہم ہے اور معانی صاف نہیں ہوتے۔ پروفیسر کرار حسین کا خیال ہے کہ بہت کم آدمیوں نے خطبات کو پڑھا ہو گا۔ اس کتاب کو پڑھنا اور سمجھنا بہت مشکل ہے۔ کہیں کہیں تو اپنے آپ کو ہی سمجھانا پڑتا ہے کہ ہاں اب سمجھ گئے آگے چلو۔"[2]

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے خطبات عامۃ الناس کے لیے نہیں لکھے تھے بلکہ ان کے پیش نظر خواص کا طبقہ تھا۔ اس کا جواب الجواب یہ دیا گیا ہے کہ عوام الناس نے تو خطبات پڑھنے کی کوشش ہی نہیں کی، خطبات کی تفہیم و تشریح کی طرف اگر کسی نے قدم اٹھایا ہے تو وہ خواص ہی کا حلقہ تھا اور خواص ہی نے خطبات کے عسیر الفہم ہونے کا شکوہ درج کروایا ہے۔ ماہنامہ 'ساحل' کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"اس اعتراض کا عمومی جواب اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی زبان میں یہ دیا جاتا ہے کہ خطبات کے مخاطب عام لوگ نہیں طبقہ خواص ہے۔ دوسرے لفظوں میں علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے والی اشرافیہ جو ٹائی کوٹ پہننے اور فراٹے سے انگریزی بولنے کو علم کا آخری مرتبہ سمجھتی تھی۔ لیکن خطبات کے ادق عسیر الفہم مباحث اس طبقہ اشرافیہ کی ذہنی سطح سے بھی بہت بلند تھے۔ لہٰذا خطبات کا دائرہ نہایت محدود ہو گیا۔ اس سے نہ جدید ذہن استفادہ کر سکا اور قدیم ذہن تو ان کو سمجھنے کی استعداد، اہلیت، علمیت رکھتا ہی نہیں تھا، وہ نہ اسے رد کر سکتا تھا نہ قبول نہ اس پر نقد

---

1. تقي عثماني، محمد، مفتي، الاجتهاد الجماعي، المؤتمر العالمي للفتوى وضوابطها: 17-20/1/2009ء، رابطة العالم الإسلامي، المملكة العربية السعودية: ص10-11

2. علماء کے خوف سے خطبات کا اردو ترجمہ نہیں کیا گیا: ص35

کے قائل تھا۔ پھر خطبات آخر کس کے لیے لکھے گئے؟ یہ اہم ترین سوال ہے۔ اس کا جواب سہیل عمر نے عمد گی سے دیا ہے کہ اپنے لیے لکھے گئے تھے۔"[1]

لیکن اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے یہ خطبات اپنے لیے لکھے تھے تو یہ بھی ایک المیہ ہے کہ بعض اوقات خود اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ان خطبات کی بعض عبارتوں کا مفہوم سمجھ نہ آتا تھا۔ نذیر نیازی (متوفیٰ 1977ء) نے جب اقبال رحمۃ اللہ علیہ سے خطبات کے بعض مقامات کے مفاہیم سمجھنا چاہے تو اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ معلوم نہیں کس وجدانی کیفیت میں ان سے یہ عبارتیں صادر ہوئیں اور ان کو سمجھنے کے لیے بھی اسی وجدانی کیفیت یا حال میں واپسی ضروری ہے۔ ماہنامہ 'ساحل' کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"خود علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ خطبات کے بہت سے مقامات کے بارے میں یہی رائے رکھتے تھے۔ نذیر نیازی کے حوالے سے اسرار سہاروی نے لکھا ہے کہ جب نذیر نیازی نے اقبال رحمۃ اللہ علیہ سے بعض مقامات کے مطالب سمجھنا چاہے تو حضرت علامہ نے فرمایا: نذیر! یہ مقامات وہ ہیں جن پر خود غور وفکر کرتا ہوں تو ذہن پر واضح نہیں ہوتے، نامعلوم کسی وجدانہ کیفیت میں، میں نے یہ باتیں لکھیں۔ یہ تمام مقامات وجدانی ہیں، فکری نہیں، وجدان کے ذریعے سے ہی گرفت میں آسکتے ہیں، انھیں پڑھتے رہو کبھی تم پر بھی اگر میری جیسی وجدانی کیفیت طاری ہوئی تو کشف کے طور پر ظاہر ہو جائیں گے لیکن تم محسوس کر سکو گے ان کا اظہار یا ابلاغ نہ کر سکو گے۔ یہ بالکل معرفت کا سا معاملہ ہے۔ نذیر نیازی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: تو حضرات وہ وجدان مجھے ابھی تک حاصل نہیں ہوا۔"[2]

'خطباتِ اقبال' ڈاکٹر اقبال کے ذہنی وفکری ارتقاء کے درمیانی مراحل

'خطباتِ اقبال' درحقیقت اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے فکری ارتقاء کے مختلف مراحل ہیں اور ان کو اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی آخری فکر سمجھنا درست نہیں ہے۔ لیکن ماہرین اقبالیات کا ایک طبقہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات کو ان کی پختہ فکر اور آخری رائے کے طور پر پیش کرتا ہے۔ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایسے ہی افراد کے بارے میں، جو اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے فکری ارتقاء کے مختلف مراحل کو مدنظر رکھے بغیر ان کے کلام سے استدلال کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

"آج کل ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے متعدد رسائل نکل رہے ہیں اور مجلسیں قائم ہو رہی ہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ اشخاص بھی بتدریج ترقی کر کے منزلِ مقصود کے احاطے میں داخل ہوتے ہیں اور ان کے خیالات بھی اسی تدریج کے ساتھ کمال کے مرتبے کو پہنچتے ہیں۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ ہر شئے جو ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کے فائل میں نکل آئے وہ ان کی تعلیم ہے تو سراسر غلط ہو گا، بلکہ وہی چیزیں ان کی تعلیمات کے عناصر ہوں گی

[1] ادارہ ساحل، خطبات اقبال ایک تحقیقی مطالعہ، (ماہنامہ) ساحل، کراچی، جلد 1، شمارہ 6، جون 2006ء، ص 7

[2] علماء کے خوف سے خطبات کا اردو ترجمہ نہیں کیا گیا: ص 35-36

جن پر ان کے قلم نے ایک مدت کی تلاش کے بعد آرام کی سانس لی اور جس منزل پر پہنچ کر ان کے خیال کے مسافر نے اقامت اختیار کی۔ اس بنا پر آج کل رسالوں کے کارخانوں میں جو مال تیار ہوتا ہے اور اس پر ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے نام کا مارکہ لگا کر جو دکان داری کی جا رہی ہے، وہ ہمت افزائی کے لائق نہیں۔ کبھی فرصت سے سن لینا بڑی ہے داستان میری۔"[1]

ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی حفظہ اللہ نے خطباتِ اقبال کو ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے غور فکر کے درمیانی مراحل قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس سلسلے میں بحث شروع کرنے سے قبل یہ امر واضح کرنا ضروری ہے کہ تحریک پاکستان کے حوالے سے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا فکری مقام بلاشبہ مسلم ہے اور اس تناظر میں فکر اقبال کی اپنی جگہ اہمیت بھی بجا ہے لیکن علامہ کی اس حیثیت کا یہ لازمہ نہیں کہ انہیں ائمہ سلف کے مقابل لا کھڑا کیا جائے اور پھر اس تقابل کے نتیجے میں ائمہ سلف کو دور ملوکیت کا پروردہ جبکہ اقبال کو 'اسلامی نشاۃ ثانیہ کا 'حدی خوان' قرار دیا جائے جیسا کہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے بعض مداحوں کا شیوہ ہے۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ ائمہ سلف اور اقبال کے میدان ہائے کار الگ الگ تھے اور انہیں پیش آنے والے حالات میں بھی باہمی مماثلت موجود نہیں۔ جو لوگ اسلامی ریاست کی فکری تشکیل میں علامہ کے نظریات کو دلیل بنا کر انہیں مجتہد مستقل کا مقام دینا چاہتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے یہ نظریات ان کی ٹھوس آراء کی بجائے ان کے ارتقائی نظریات تھے۔ چنانچہ کائنات ارضی کے مختلف حصوں میں رونما ہونے والے واقعات پر غور و فکر کے نتیجے میں اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے ان نظریات کو، جو فکر اقبال کے حاملین کو ان کے عقائد نظر آتے ہیں، منزل تک پہنچنے سے قبل اس راہ کی بھول بھلیوں یا درمیانی مراحل کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔"[2]

کیا ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی دفعہ اجتماعی اجتہاد کا تصور پیش کیا؟

بعض ماہرینِ اقبالیات کا یہ دعوی ہے کہ ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی دفعہ اپنے خطبہ اجتہاد میں اجتماعی اجتہاد کا تصور پیش کیا جبکہ یہ بات درست نہیں ہے۔ ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ تاریخی واقعات کی روشنی میں ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے خطبہ اجتہاد کی تالیف کا وقت بعض ماہرینِ اقبالیات کے نزدیک 1920ء ہے جبکہ بعض کے ہاں 1922ء یا 1924ء یا 1925ء ہے۔ بہر حال کسی کا بھی کہنا یہ نہیں ہے کہ 1920ء سے پہلے ہی ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے یہ خطبہ لکھ لیا تھا۔ دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مصر میں 1911ء میں ہی حکومت مصر کی

1 ادارہ ساحل، آمالی غلام محمد: سہیل عمر کے اعتراضات کا جائزہ، (ماہنامہ) ساحل، کراچی، جلد 1، شمارہ 9، ستمبر 2006ء، ص (ج)
2 مدنی، عبد الرحمن مدنی، حافظ، اجتماعی اجتہاد کے تناظر میں تعبیر شریعت اور پارلیمنٹ: ص 14-15، مجلس تحقیق اسلامی، لاہور، 2005ء

طرف سے اجتماعی اجتہاد کے لیے مذاہب اَربعہ کے علماء پر مشتمل ایک کمیٹی بنادی گئی تھی جو بعض عائلی قوانین، اجتماعی اجتہاد کے ذریعے مرتب کر رہی تھی۔ ان علماء کی کمیٹی کا ایک مسودہ قانون 1916ء میں مصر سے شائع بھی ہو چکا ہے جو 1917ء میں دوبارہ تنقیح و تہذیب کے بعد شائع ہوا تھا۔ پس علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اجتماعی اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ کا تصور سب سے پہلے پیش کیا لیکن تاریخی اعتبار سے یہ بات بالکل بھی درست نہیں ہے کہ ان کے خطبہ اجتہاد سے پہلے امت مسلمہ میں اجتماعی اجتہاد کا کوئی تصور ہی موجود نہ تھا۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اجتہاد کی ضرورت کے داعی تھے یا مجتہد مطلق؟

بعض ماہرینِ اقبالیات کا یہ بھی خیال ہے کہ ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اجتہاد کی ضرورت و اہمیت کی طرف توجہ دلائی ہے نہ کہ خود کو مجتہد قرار دیا ہے لیکن یہ دعوی امر واقعہ کے خلاف ہے۔ ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے مطلق اجتہاد کی ضرورت و اہمیت پر زور دیا ہے لیکن اس کے ساتھ اپنے خطبہ اجتہاد میں وہ ہمیں اُس وقت ایک مجتہد مطلق کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں، جب وہ کسی نص کے فہم پر امت کے اجماع کی حجیت کا انکار کرتے ہیں یا وہ قرآن کی ابدی سزاؤں کو عربوں کے مزاج اور مخصوص تمدنی حالات کے ساتھ خاص کرتے نظر آتے ہیں۔ کئی ایک ماہرین اقبالیات نے ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے اجتہادات کی فہرستیں مرتب کی ہیں۔ جناب محمد ظفر اقبال لکھتے ہیں:

> ”آج ماہرین اقبال یہ کہہ رہے ہیں کہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اجتہاد کی ضرورت کا دعویٰ کیا ہے لیکن خود مجتہد بننے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ ہم اس بیان سے اتفاق کے باوجود اپنے ان کرم فرماؤں کو دعوت دیتے ہیں کہ اقبال کے 'اجتہادات' ڈاکٹر خالد مسعود صاحب کی کتاب 'اقبال کا تصورِ اجتہاد' کے چھٹے باب میں بہ عنوان 'اجتہاداتِ اقبال' ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ اگر اس کے جواب میں مجھ سے یہ کہا جائے کہ یہ اقبال کا 'اجتہاد' نہیں بلکہ ان کی 'رائے' ہے تو پھر ہم ادب سے عرض کریں گے کہ آپ حضرات کے خامہ گوہر بار کو اس وقت جنبش کیوں نہ ہوئی جب ڈاکٹر خالد مسعود صاحب اور ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ صاحب (جو اقبال کو 'مجتہد مطلق' باور کراتے ہیں) اقبال کی مختلف آراء کو 'اجتہاداتِ اقبال' کے نام سے شائع فرما رہے تھے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس وقت 'وضاحتی مضمون' شائع کر دیا جاتا۔ اگر کسی کے مقام کو اس کی اصل حیثیت سے گرانا غلط بات ہے تو مداح سرائی میں غلو و افراط بھی قابلِ تردید و مذمت ہے۔“[1]

ڈاکٹر یوسف گورایہ کا نظریہ اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ

ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے اس فلسفے کو کئی ایک مفکرین نے ایک نظامِ فکر کے طور پر پیش کیا۔ ڈاکٹر یوسف گورایہ

1 ساحل کے مباحث پر نقد، (ماہنامہ) ساحل، کراچی، نومبر 2006ء، ص 78

کے نقطہ نظر کے مطابق اسمبلی ممبران کی پاس کردہ قراردادیں، کتاب و سنت کے ماہر فقہاء و مجتہدین کی آراء کے بالمقابل قابل ترجیح ہوں گی کیونکہ سیاسی پارٹیوں کے اسمبلی ممبران کا اجتہاد، اجتماعی اجتہاد ہے، جبکہ فقہاء و مجتہدین کا اجتہاد انفرادی اجتہاد۔ ڈاکٹر یوسف گورایہ لکھتے ہیں:

”اسلام میں اختیارِ حکمرانی پوری امت کو حاصل ہے۔ اسلامی آئین کی اس دفعہ نے اسلام کو تمام مذاہب عالم پر جمہوری فوقیت عطا کر دی ہے۔ اسلام میں جمہور مسلمانوں کی آزادانہ، منصفانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے عامہ کے ذریعے اختیار حکمرانی، ان کے منتخب نمائندوں کو منتقل ہوتا ہے۔ جن پر مشتمل منتخب نمائندہ پارلیمنٹ، جمہور مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے اجتماعی اجتہاد کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ منتخب پارلیمنٹ کا اجتماعی اجتہاد، انفرادی اجتہاد سے کالعدم، منسوخ یا تبدیل نہیں ہو سکتا۔ کوئی انفرادی اجتہاد، چاہے وہ کتنے بڑے مجتہد کا ہو، اجتماعی اجتہاد کی جگہ نہیں لے سکتا۔ انفرادی اجتہاد کو پہلے اپنے آپ کو مسلمانوں کی نمائندہ منتخب پارلیمنٹ سے منوانا پڑے گا، پھر وہ اجتماعی اجتہاد پر اثر انداز ہو سکے گا۔“[1]

ڈاکٹر یوسف گورایہ کے بقول پارلیمنٹ کے اجتہادات تعبیرِ شریعت ہیں اور اگر پارلیمنٹ کا کسی اجتہاد پر اتفاق ہو جائے تو اس کی حیثیت اجماع کی ہو گی، جیسا کہ کسی بھی ملک کے آئین پر پارلیمنٹ کا اجتہاد ہوتا ہے، لہٰذا ریاست کے آئین کی مخالفت یا اس کی تنسیخ یا اس میں تبدیلی اجماعِ امت کی خلاف ورزی کے قائم مقام ہے۔ ڈاکٹر یوسف گورایہ لکھتے ہیں: ”جمہور مسلمانوں کی منتخب پارلیمنٹ کا منظور کردہ آئین، اس دور کی تعبیر شریعت پر مبنی اجتماعی اجتہاد ہے۔ جو خطا سے مبرا ہے۔ حدیث رسول مقبول ﷺ ہے: «إن الله لا يجمع أمتي على ضلالة» میری امت گمراہی پر جمع نہ ہو گی۔ اس حدیث کے مطابق مسلمانوں کا اجتماعی اجتہاد گمراہی پر مبنی نہیں ہوتا، گمراہی کے مقابلے میں ہدایت ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا اجتماعی اجتہاد ہدایت پر مبنی ہوتا ہے... اس اعتبار سے اسلامی ریاست کی منتخب نمائندہ پارلیمنٹ کے منظور کردہ آئین کو تقدس کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔“[2]

ڈاکٹر یوسف گورایہ مملکت پاکستان میں فوجی جرنیلوں کی طرف سے لگائے گئے مارشل لاز (Marshal Laws) سے اس قدر ردعمل میں ہیں کہ وہ ایسے آمروں کو جہنم واصل کرنے کے لیے پارلیمنٹ کے اجتماعی اجتہاد اور اجماع کے تصور کو دلیل بناتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”ان مباحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کی منتخب نمائندہ پارلیمنٹ کو آمریت کے ذریعے ختم کرنا اور منتخب نمائندہ پارلیمنٹ کے منظور شدہ آئین کو آمریت کے ذریعہ کالعدم قرار دینا یا منسوخ کرنا یا تبدیل کرنا ”اتباع غیر سبیل المؤمنین“ ہے۔ مومنین کی روش سے ہٹ کر چلنا ہے۔ جو جہنم کی طرف جاتی ہے اور آمر کو واصل جہنم بناتی ہے۔ قرآن و سنت کی مستند، مسلمہ اور مصدقہ تعلیمات کے مطابق ایسے مجرم کو دنیا میں شدید

1 گورایہ، محمد یوسف، اسلام آئین اور صوابدید: ص 38، زین پبلشرز، لاہور، 1994ء
2 اسلام آئین اور صوابدید: ص 41

ترین سزا دی جا سکتی ہے۔"[1]

یہ ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ کی ارتقائی شکل ہے کہ جس کے مطابق پارلیمنٹ کی قانون سازی شریعت الٰہی کی متفق علیہ تعبیر کا درجہ اختیار کر جاتی ہے اوراس کی مخالفت کسی شخص کو جہنمی اور واجب القتل بنانے کے لیے کافی قرار پاتی ہے۔ڈاکٹر یوسف گورایہ لکھتے ہیں:

"آئین مسلمانوں کی منتخب نمائندہ پارلیمنٹ کے اجتماعی اجتہاد سے منظور ہوتا ہے، جسے اسلامی ریاست میں تقدس کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ آئین قرآن وسنت کی تعبیر اور شریعت کی توجیہ ہوتا ہے۔ جس کی حقانیت اور صداقت کی دلیل قوم کے اجتماعی اجتہاد کی صورت میں موجود ہوتی ہے۔اجتماعی اجتہاد ہدایت اور صراط مستقیم پر قائم ہوتا ہے۔اس دینی، قومی اور اجتماعی مقدس امانت کو جو فرد، فرقہ یا طبقہ کالعدم، منسوخ یا معطل کرتا ہے وہ دراصل قومی شہ رگ کو کاٹتا ہے۔وہ جمہور مسلمانوں کے بنیادی حقوق، قانون کی حکمرانی اور شہری آزادیوں پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔اس لیے ایسا شخص قاتل اور ڈاکو کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے، اس پر قتل اور ڈاکے کا مقدمہ چلا کر اسے پھانسی کی قرآنی سزا دی جانی چاہیے۔"[2]

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 2010) کا نقطہ نظر یہ ہے کہ کسی بھی ملک میں قانون سازی تو پارلیمنٹ ہی کرے گی اور پارلیمنٹ میں قانون سازی، بذریعہ اجتہاد ہی ہو سکتی ہے۔لیکن ان کے نزدیک پارلیمنٹ ایک تو اس صورت اجتہاد کی اہل ہو سکتی ہے جبکہ اس کے ممبران درجہ اجتہاد پر فائز ہوں۔وہ لکھتے ہیں:

"اب پارلیمنٹ میں قانون سازی ہو رہی ہے، وہاں تو ان پڑھ لوگ بھی بیٹھے ہیں، انہیں کیا پتہ کہ ہم نے دین سے تجاوز کر دیا ہے۔اب آپ کیا کریں گے؟اس کے لیے دو ہی راستے ممکن ہیں۔ایک یہ کہ یا تو پارلیمنٹ میں محض علماء ہی نہیں بلکہ صرف مجتہدین جائیں۔تب تو انہیں اختیار دیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی کثرت رائے سے قانون سازی کر لیں۔یہ قانون سازی شریعت سے متصادم نہیں ہو گی۔"[3]

اگر تو پارلیمنٹ میں مجتہدین ممبران نہ ہوں، جیسا کہ ہر مسلمان ملک میں تقریباً ایسا ہی معاملہ ہے تو اس صورت میں پارلیمنٹ کا اجتہاد کیسے معتبر ہو گا؟اس بارے میں جناب ڈاکٹر اسرار رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ اس صورت میں پارلیمنٹ کو صرف مباحات کے دائرے میں قانون سازی کی اجازت ہو گی۔وہ فرماتے ہیں:

"اگر آپ نے پارلیمنٹ میں وسیع البنیاد نمائندگی رکھی ہے تو پارلیمنٹ کو یہ اختیار ہے کہ مباحات (allowed

1 اسلام آئین اور صوابدید: ص45

2 أیضاً: ص46-47

3 اسرار احمد، ڈاکٹر، عہد حاضر میں اجتہاد کا طریق کار، (ماہنامہ) میثاق، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، جلد46، شمارہ10، اکتوبر1997ء، ص18

and permissible in Islamic Sharia) کے معاملے میں کثرت رائے سے فیصلہ کر دے۔"[1]

ڈاکٹر صاحب کی اس رائے پر جب یہ سوال پیدا ہوا کہ اس بارے میں بھی تو اختلاف ہو سکتا ہے کہ پارلیمنٹ ایک امر کو مباح قرار دے رہی ہو اور قرآن وسنت کی روشنی میں علماء اسے حرام کہنے پر مصر ہوں۔ اس اختلاف کا حل کیا ہے؟ ڈاکٹر صاحب اس کے حل کے بارے میں لکھتے ہیں:

"لیکن کوئی شيء مباح ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ اس کے لیے آپ کو عدالت کا کنڈا کھٹکھٹانا ہو گا۔ اس سے ﴿فردوہ إلی الله والرسول﴾ کا تقاضا کسی حد تک پورا ہو جائے گا۔ یعنی اسلامی ریاست کی عدلیہ یہ طے کرے گی کہ قانون سازی میں کتاب وسنت کے اصولوں سے تجاوز ہوا یا نہیں؟ اگر وہ طے کر دیتی ہے کہ تجاوز ہو گیا ہے تو قانون کالعدم ہو جائے گا، لیکن عدالت نیا قانون نہیں بنائے گی۔ قانون پھر اسی پارلیمنٹ کو بنانا ہے جو کتاب وسنت کے دائرے کے اندر اندر رہو۔"[2]

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تجویز اس وقت قابل عمل ہو سکتی ہے جبکہ عدالتوں میں جو جج متعین کیے جائیں وہ علوم اسلامیہ سے واقف ہوں۔ ہمارے نزدیک ایک دوسرا قابلِ عمل حل یہ ہو سکتا ہے کہ صرف وفاقی شرعی عدالت ہی کو یہ اختیار دیا جائے کہ پارلیمنٹ کے بنائے گئے قوانین پر نظر ثانی کر سکے اور اس عدالت میں مختلف مکاتب فکر کے فقہاء وعلماء کو موثر نمائندگی دی جائے۔

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے بقول اس طریقہ کار کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ ہر شخص عدالت کی طرف رجوع کر سکتا ہے اور یہ دعوی کر سکتا ہے کہ فلاں قانون کتاب وسنت کے منافی ہے، لہذا اس کو ختم ہونا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اب قوت نافذہ اس مقننہ (Legislature) کے پاس ہے۔ یعنی مباحات کے دائرے کے اندر کس چیز کو اختیار کیا جائے، یہ فیصلہ کرنے کا اختیار پارلیمنٹ کے پاس ہے۔ فرض کیجیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس نے قوت نافذہ کے استعمال میں کتاب وسنت سے تجاوز کیا ہے تو میں جاؤں گا اور عدلیہ (Judiciary) یعنی اعلی عدالتوں کا کنڈا کھٹکھٹاؤں گا کہ مجھے موقع دیا جائے، میں ثابت کرتا ہوں کہ قانون سازی میں کتاب وسنت سے تجاوز ہو گیا ہے۔ یہ طریقہ ہے جو اس دور میں قابل عمل ہو گا۔ لیکن ظاہر بات ہے نئی قانون سازی کے لیے پھر پارلیمنٹ ہی کی طرف رجوع کیا جائے گا، اس لیے کہ قوت نافذہ تو اس کے پاس ہے۔ ورنہ اگر قانون سازی کا آخری اختیار عدلیہ کو دے دیا جائے تو پھر تو عدلیہ کی حکومت ہو گئی۔ پارلیمنٹ کا کام کیا رہ جائے گا؟ عدلیہ کا کام صرف ایک ماہرانہ رائے (Expert Opinion) دینا ہے کہ آیا کسی معاملے میں کتاب وسنت کی حدود سے تجاوز تو نہیں ہو گیا۔ اگر نہیں ہوا تو عدلیہ اس قانون کو برقرار رکھے گی۔ اور اگر عدلیہ اس نتیجے پر پہنچے کہ قانون سازی میں کتاب وسنت کی حدود سے تجاوز ہو گیا ہے تو یہ قانون واپس پارلیمنٹ کے سپرد کیا جائے گا کہ وہ اس میں ترمیم

[1] عہد حاضر میں اجتہاد کا طریق کار: ص 18

[2] ایضاً: ص 18-19

کرے یا نیا قانون بنائے۔"[1]

اگر تو ہر شخص کو ہی یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ کسی قانون کے کتاب وسنت کے منافی ہونے کے بارے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکے تو عدالتیں سارا سال قرآن وسنت کے منافی قوانین کے درخواستوں کی سماعتیں ہی کرتی رہیں گی۔ اس لیے اس بارے اجازت ایک خاص درجے تک علم رکھنے والے اصحاب کے لیے ہونی چاہیے۔

اگر پارلیمنٹ کو مباح امور میں قانون سازی کا حق تو حاصل ہو لیکن اس پر عدلیہ کی نگرانی موجود ہو تو اس صورت میں پارلیمنٹ اگرچہ مجتہدین پر مشتمل نہ بھی ہو، پھر بھی قانون بنانے میں محتاط ہو گی اور کوئی بھی قانون سازی کرنے سے پہلے علماء وفقہاء سے مشورہ ضرور کرے گی۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"اگر ایسا ہو جائے گا تو خود پارلیمنٹ قانون سازی میں خوب سوچ وبچار سے کام لے گی اور ماہرین کی رائے سے کوئی قانون بنائے گی۔ پارلیمنٹ میں اگر کوئی بل پیش کیا جائے گا تو پہلے علماء سے مشورہ کیا جائے گا۔ خود ارکان پارلیمنٹ کو یہ اندیشہ ہو گا کہ ایسا نہ ہو کہ ہم تو سارے پاپڑ بیل کر اس قانون کو پاس کروائیں اور کوئی جا کر عدلیہ سے یہ فتویٰ حاصل کر لے کہ یہ تو کتاب وسنت کے خلاف ہے، اس طرح تو ہماری تمام تر محنت کے اوپر پانی پھر جائے گا۔ اب بھی ہماری اسمبلی میں اگر کوئی بل پیش ہوتا ہے تو اس پر ماہرین کی رائے لی جاتی ہے... پارلیمنٹ کا کام اجتہاد یعنی قانون سازی ہے۔ اس مقصد کے لیے پارلیمنٹ علماء کے اجتہاد سے فائدہ اٹھائے گی... آخر انہیں قانون بنانا ہے تو انہیں ملک کے اندر جو بھی اصحاب علم ہوں گے ان کی آراء سامنے رکھنی ہوں گی۔ وہ ان آراء پر خود بھی غور وفکر کریں گے اور اپنے پاس ایسے ماہرین بھی رکھیں گے جو ان آراء کا اچھی طرح جائزہ لیں، ان کو (Scruitinize) کریں۔ پھر اسمبلی وہ قانون پاس کرے گی۔ اس کے بعد انتظامیہ (Executive) اس قانون کو نافذ کرے گی، اگر یہ کتاب وسنت کے منافی ہے تو عدلیہ (Judiciary) اسے کالعدم قرار دے گی۔ چنانچہ ان ریاستی اداروں کا علیحدہ علیحدہ کام کرنا بہت ضروری ہے۔"[2]

ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ 'اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ' کے بارے ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا خیال یہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں پارلیمنٹ کے اجتہاد سے مراد اجتہاد کا نفاذ ہے نہ کہ خود اجتہاد کرنا۔ وہ فرماتے ہیں:

"دور نبوت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی اجتہاد کرنے اور اسے نافذ کرنے کا اختیار تھا اور یہی کیفیت بالعموم خلافت راشدہ میں جاری رہی... بعد میں جب بادشاہت کا دور آیا تو اجتہاد کا حق علماء کو حاصل ہو گیا، جبکہ اسے نافذ کرنے اور نہ کرنے کا اختیار حاکم وقت یا خلیفہ وقت کے پاس تھا۔ آج کے دور میں قوت نافذہ چونکہ پارلیمنٹ کے پاس ہے، اس لیے پارلیمنٹ ہی اسے منظور اور نافذ کرے گی۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے جو بات اپنے خطبات میں کہی تھی کہ اجتہاد

---

1 عہد حاضر میں اجتہاد کا طریق کار: ص 19-20
2 ایضاً: ص 19-21

بذریعہ پارلیمنٹ ہو گا، اس سے میرے نزدیک ان کی یہی مراد تھی ورنہ اجتہاد تو ظاہر ہے وہی لوگ کریں گے جنہیں دینی علوم میں مہارت حاصل ہو گی۔"[1]

ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے خطبہ اجتہاد کی عبارتیں اس لحاظ سے بالکل واضح ہیں کہ ان کے نزدیک پارلیمنٹ کے اجتہاد سے مراد، عصر حاضر میں پارلیمنٹ کو 'مجتہد مطلق' کا فریضہ سرانجام دینا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"The transfer of the power of Ijtihad from individual representatives of schools to a Muslim legislative assembly which، in view of the growth of opposing sects، is the only possible form Ijma can take in modren times، will secure constributions to legal dicussions from laymen who happen to possess a keen insight into affairs...In India، however، difficulities are likely to arise for it doubtful whethera non-Muslim legislative assembly can excercise the power of Ijtihad."[2]

سید نذیر نیازی اس عبارت کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مذاہب اربعہ کے نمائندے جو سر دست فرداً فرداً اجتہاد کا حق رکھتے ہیں، اپنا یہ حق مجالس تشریعی کو منتقل کر دیں گے۔ یوں بھی مسلمان چونکہ متعدد فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اس لیے ممکن بھی ہے تو اس وقت اجماع کی یہی شکل۔ مزید بر آں غیر علما بھی جو ان امور میں بڑی گہری نظر رکھتے ہیں، اس میں حصہ لے سکیں گے... ہندوستان میں البتہ یہ امر کچھ ایسا آسان نہیں کیونکہ ایک غیر مسلم مجلس کو اجتہاد کا حق دینا شاید کسی طرح ممکن نہ ہو۔"[3]

ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت میں چار مقامات ایسے ہیں جو ان کے نظریہ اجتہاد کی وضاحت کر رہے ہیں:

الف) ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ اس مقام پر مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں یعنی افراد سے اجتہاد کا حق لینے کی بات کر رہے ہیں تو امت مسلمہ کی تاریخ میں کیا کبھی مجتہدین کے پاس اجتہاد کے نفاذ کا حق رہا ہے؟ کیا اقبال رحمۃ اللہ علیہ اس سے ناواقف تھے کہ مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں کا اجتہاد کیا تھا؟ اگر نہیں تو اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں جب مکاتب فکر کے نمائندوں سے پارلیمنٹ کی طرف اجتہاد کے منتقل ہونے کی بات ہوتی ہے تو کیا اس سے مراد مکاتب فکر کے نمائندوں سے اجتہاد کے نفاذ کی اس قوت کو پارلیمنٹ کی طرف منتقل کرنا ہے جو پوری تاریخ اسلامی میں کبھی ان

1 خالد مسعود، محمد، ڈاکٹر، اقبال کا نظریہ اجتہاد اور عصری تقاضے: ماہرین اقبال اور اہل علم کی نظر میں، (سہ ماہی) اجتہاد، اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد، جلد 1، شمارہ 1، جون 2007ء، ص 74

2 The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam : p. 138

3 تشکیل جدید الہیات اسلامیہ: ص 248-249

کے پاس رہی ہی نہیں؟

ب) یہاں ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ اجتہاد کے ساتھ ساتھ اجماع کی بھی بات کر رہے ہیں۔ڈاکٹر اسرار رحمۃ اللہ علیہ کی ت
لیں تو اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں اجماع کا مفہوم یہ بنے گا کہ اگر کسی مجتہد کی رائے کو کوئی پارلیمنٹ بالاتفاق نافذ کر دے
اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں اجماع حاصل ہو جائے گا۔کیا اقبال رحمۃ اللہ علیہ اجماع کے مفہوم میں کنفیوز تھے کہ کسی رائے
نفاذ پر اتفاق کو اجماع کہتے ہیں یا کسی رائے پر علمی اتفاق کا نام اجماع ہے؟

ج) ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ پارلیمنٹ کا اجتہاد ایسا ہو گا کہ غیر علماء جو مختلف فنون کے ماہ
ہوں وہ بھی کسی مسئلے کے بارے میں قانونی بحث میں حصہ لے سکیں گے۔اب قانونی بحث اور قانون کے نفاذ
کیا فرق ہے، یہ شاید اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں تو کم از کم واضح ہو گا۔

ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ انڈیا کی پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق نہیں دے رہے۔حالانکہ اگر ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی تعب
جائے تو اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں انڈیا کی اسمبلی کے لیے بھی اجتہاد کا حق جائز ہونا چاہیے۔اس میں کیا حرج ہے
علمائے دیوبند انڈیا کے مسلمانوں کے لیے اجتہاد کریں اور انڈیا کی اسمبلی اس کو نافذ کر دے۔اگر اقبال رحمۃ اللہ علیہ
نزدیک 'اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ' سے مراد اجتہاد کا صرف نفاذ ہی ہے تو پھر انڈیا کی پارلیمنٹ بھی اجتہاد کر
ہے۔لیکن مذکورہ بالا عبارت کے مطابق اقبال رحمۃ اللہ علیہ اس کے قائل نہیں ہیں۔ایک اور جگہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہ

"one more question may be asked as to the legislative activity of a modern Muslim assembly which must consist، at least for the present' mostly of men possessing no knowledge of the subtleties of Muhammadan Law. Such an assembly may make grave mistakes in their interpretaion of law. How can we exclude or at least reduce?...The Ulema should form a vital part of a Muslim legislative assembly helping and guiding free discussion on questions relating to law."[1]

سید نذیر اس عبارت کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لیکن ابھی ایک اور سوال ہے جو اس سلسلے میں کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ موجودہ زمانے میں تو جہاں کہیں
مسلمانوں کی کوئی قانون ساز مجلس قائم ہو گی اس کے ارکان زیادہ تر وہی لوگ ہوں گے جو فقہ اسلامی کی نزاکتو
سے ناواقف ہیں۔لہٰذا اس کا طریق کار کیا ہو گا، کیونکہ اس قسم کی مجالس شریعت کی تعبیر میں بڑی بڑی شدی
غلطیاں کر سکتی ہیں۔ان غلطیوں کے ازالے یا کم سے کم امکان کی صورت کیا ہو گی؟...انہیں چاہیے مجالس قانو

The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam : p. 139

ساز میں علماء کو بطور ایک موثر جزو شامل تو کر لیں لیکن علماء بھی ہر امر قانونی میں آزادانہ بحث و تمحیص اور اظہار رائے کی اجازت دیتے ہوئے اس کی رہنمائی کریں۔"[1]

ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے خطبہ اجتہاد کا یہ مقام بھی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان کے ہاں 'اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ' سے مراد محض اس کا نفاذ نہیں ہے کیونکہ ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں اگر پارلیمنٹ کا کام صرف اجتہاد کو نافذ کرنے کا ہے تو ان کو یہ سوال پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ پارلیمنٹ کے ممبران فقہ اسلامی کی نزاکتوں سے واقف نہیں ہوں گے۔

اسی طرح اقبال رحمۃ اللہ علیہ پارلیمنٹ کے اجتہاد میں علماء کو شریک کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ علماء کا اجتہاد کے نفاذ سے کیا تعلق ہے۔ اگر پارلیمنٹ نے صرف اجتہاد کو نافذ ہی کرنا ہے تو پھر علماء کو پارلیمنٹ میں شریک کرنے اور آزادانہ بحث و تمحیص کا مشورہ دینے کے کیا معنی ہیں؟

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے نقطہ نظر کی جو تاویل یہاں کی تھی وہ ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی تعریفِ اجتہاد کے بھی برعکس ہے۔ ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ اجتہاد کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"The word literally means to exert. In Islamic terminology of Islamic Law it means to exert with a view to form an independent judgement on a legal question."[2]

سید نزیر نیازی اس عبارت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

"لغوی اعتبار سے تو اجتہاد کے معنی ہیں کوشش کرنا، لیکن فقہ اسلامی کی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے وہ کوشش جو کسی قانونی مسئلے میں آزادانہ رائے قائم کرنے کے لیے کی جائے۔"[3]

ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں اجتہاد قانونی رائے بنانے کا نام ہے نہ کہ کسی رائے کو نافذ کرنے کا۔ اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ پارلیمنٹ کے لیے صرف مباح امور میں اجتہاد کے قائل تھے تو یہ بھی درست نہیں ہے۔ ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ پارلیمنٹ کو مجتہد مطلق کے مقام پر فائز کرنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خطبہ اجتہاد کے شروع میں اجتہاد کی تین قسمیں بیان کیں ہیں اور اس کے معاً بعد فرماتے ہیں:

"In this paper I am concerned with the first degree of ijtihad only' i.e. Complete authority in legislation."[4]

سید نزیر نیازی اس عبارت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

1 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ: ص 251

2 The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam : p. 117

3 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ: ص 222

4 The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam : p. 118

”اس مقالے میں، میں اجتہاد کے صرف پہلے درجے کے بارے میں گفتگو کروں گا جو کہ قانون سازی میں مکمل اختیار کا نام ہے۔“

پس ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں پارلیمنٹ کا اجتہاد قانون سازی ہے نہ کہ قانون کی تنفیذ۔ اور اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ اقبال پارلیمنٹ کو مطلق اجتہاد کا فریضہ سونپنا چاہتے تھے۔

ہم یہاں یہ بھی وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مقالہ کی تکمیل کے بعد جب ہم نے مذکورہ بالا بحث ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کی تو انہوں نے اپنے موقف سے رجوع فرمالیا اور راقم الحروف کا شکریہ بھی ادا کیا اور تنظیم اسلامی کی ایک مجلس شوریٰ میں بھی اس بات کا اظہار کیا کہ وہ عنقریب اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے تصورِ اجتہاد سے متعلقہ اپنے سابقہ موقف سے رجوع کے بارے ایک تحریر اپنے رسالہ 'میثاق' میں بھی شائع کریں گے جس کی نوبت ان کی زندگی میں نہ آسکی۔ اس بحث کو مقالے میں اس لیے باقی رکھا گیا ہے کہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ (The transfer of the power of Ijtihad) سے کسی کو بھی یہ شبہ لاحق ہو سکتا ہے کہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ مطلق اجتہاد کی بجائے اجتہاد کے نفاذ کی بات کرتے ہیں۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں اس لفظ کے استعمال کی توجیہ یہ ہے کہ اصولیین نے اجتہاد کی تعریف کو ”استفراغ الوسع“ یا ”استفراغ الطاقة“ کے الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی حفظہ اللہ کا نظریہ اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ

ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی حفظہ اللہ کا شمار بھی ان علماء میں ہوتا ہے جنہوں نے اقبال کے نظریہ 'اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ' پر نقد کی ہے۔ ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی حفظہ اللہ کے بقول اگر پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دے دیا جائے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے اجتہاد کا حق علماء سے چھین کر عوام الناس میں تقسیم کر دیا جائے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اجتہاد صرف علماء اور قرآن و سنت کے ماہرین ہی کر سکتے ہیں، کیونکہ اجتہاد نام ہی قرآن و سنت کی گہرائیوں اور وسعتوں میں حکم شرعی کا تلاش کا ہے اور یہ کام عوام الناس یا ان کے منتخب کردہ نمائندوں کے بس میں نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:

”باقی رہا اجتہاد کا معاملہ تو یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اجتہاد دراصل شرعی احکام ہی کی تلاش و اطلاق کا نام ہے، کوئی نئی شریعت وضع کر لینے کا نام نہیں۔ لہٰذا اس سلسلہ میں ضرورتوں کے مطابق وہی لوگ رہنمائی دے سکتے ہیں جو کتاب و سنت کی زبان اور اس کے علوم کے ماہر اور ان کی بھرپور بصیرت رکھتے ہوں... لہٰذا علماء کو تھیاکریسی کا طعنہ دے کر اجتہادی ذمہ داریاں عوام کے سپرد کرنا نرا احمقانہ تصور ہے۔“[1]

ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی حفظہ اللہ نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ اجتہاد اگرچہ علماء کا حق ہے لیکن علما کے اجتماعی اجتہادات کو بھی ریاستی قانون کی بنا کر ریاست کے جمیع باشندوں پر نافذ کرنا درست نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”'اجتہاد' میں حکومت اتھارٹی ہے نہ علماء دین! دستور و قانون کے سلسلہ میں کسی خاص طبقے کی وضع و تعبیر کے

1 تعبیر شریعت اور پارلیمنٹ: ص 21

اعتبار سے اجارہ داری تھیا کریسی کی بنیادی روح ہے جو دلیل کی بنیار پر نہیں شخصی برتری کی بنیاد پر کسی طبقے کو حاصل ہوتی ہے۔یہی حال حکمرانوں کے تصور 'اختیار حقوق ربانی'(Devine rules of Kingdom) کا ہے۔چناچہ دستور و تعبیر میں علماء کو دائمی اور عالمگیر اتھارٹی مانا جائے یا حکمرانوں اور پارلیمنٹ کو، یہ بہر حال خدائی حقوق میں دخل اندازی ہے...یہی وجہ ہے کہ ائمہ سلف نے خود کو کبھی اتھارٹی قرار نہیں دیا۔"[1]

مولانا عبد الرحمن مدنی حفظہ اللہ کا کہنا یہ ہے کہ 'اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ' کے قائلین اکثر و بیشتر وہ لوگ ہیں جو ائمہ سلف کی تقلید کے شدید مخالف ہیں لیکن یہی مفکرین ایک طرف تو ائمہ سلف کی تقلید کی مخالفت کرتے ہیں جو کہ قرآن و سنت کے ماہرین تھے اور دوسری طرف پارلیمنٹ کی تقلید کی دعوت دیتے ہیں کہ جس کے ممبران کی اکثریت شرعی علوم کی الف باء سے بھی واقف نہیں ہوتی۔ وہ لکھتے ہیں: "طرفہ یہ کہ اس نظریہ کے حامل لوگ جس شدومد سے تقلید کی مخالفت کرتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ شور و غوغا آرائی کے ساتھ حکومت یا پارلیمنٹ کی تعبیر و تقنین کو اتھارٹی منوانے پر تلے ہوئے ہیں۔ فکر و نظر کا یہ کتنا بڑا تضاد ہے؟"[2]

ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی حفظہ اللہ کا کہنا ہے کہ پارلیمنٹ مباح امور میں نظم و نسق قائم کرنے کے لیے قانون سازی کر سکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"پارلیمنٹ کا دائرہ عمل مباح امور میں تدبیر و انتظام کی حد تک ہے! حاصل یہ ہے کہ پارلیمنٹ کا دائرہ کار صرف مباحات تک محدود ہے... اور اباحت کا بھی ایک پہلو چونکہ شرعی حکم ہونے کا ہے، اس لیے اس پر نگرانی کتاب و سنت کی رہنی چاہیے... جنگی تدابیر میں "أولي الأمر" کو اجازت ہے کہ وہ مشورہ کے بعد کوئی سی بھی تدبیر اختیار کرلیں۔ لہٰذا رسول اکرم ﷺ نے مشورہ کے بعد اساریٰ بدر کو فدیہ لے کر رہا کرنے کا فیصلہ فرمایا تھا۔"[3]

وہ ساتھ میں یہ بھی وضاحت کرتے ہیں کہ مباح امور میں قانون سازی کے وقت بھی پارلیمنٹ کو علماء کی رہنمائی حاصل ہونی چاہیے۔ ان کی تجویز کے مطابق ہمارے موجودہ نظام میں سینٹ (Senate) ایک ایسا ادارہ ہے کہ جس میں علماء و فقہاء کو مناسب نمائندگی دی جاسکتی ہے اور پھر یہ ادارہ قومی اسمبلی کی مباح امور میں قانون سازی کی نگرانی اور سرپرستی کرے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مقصد یہ ہے کہ شوریٰ یا پارلیمنٹ میں بنیادی دستور (کتاب و سنت) کے علاوہ دوسرے امور ہی زیر غور کیوں نہ ہوں، کتاب و سنت کے ماہرین کی پھر بھی ضرورت ہے۔ اس لیے اس بارے میں جن حضرات نے ارکان شوریٰ کے نمائندہ ہونے پر زور دیا ہے، تدبیری امور کی حد تک اس کی اہمیت تسلیم ہے، کیونکہ تدبیر وہی کامیاب ہوتی ہے جس میں تدبیر کرنے والوں کو رعایا کا اعتماد حاصل ہو... ﴿وأمرهم شورى بينهم﴾ کے قرآنی حکم کا ایک

---

1 تعبیر شریعت اور پارلیمنٹ: ص 22-23
2 ایضاً: ص 28
3 ایضاً: ص 57

فائدہ یہ بھی ہے کہ اس طرح اعتماد کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ تاہم تدبیری امور میں شرعی احکام کی مطابقت کی جو شرط ہے، اس کے لیے ماہرین شریعت کی طرف سے نگرانی لازمی ہے۔ شرعی امور کی نگرانی کسی الیکشن اور سلیکشن کے بغیر بھی علمائے دین پر فرض کفایہ ہے مگر پارلیمنٹ خود اپنے اوپر اگر کچھ ماہرین شریعت و قانون کو نگران بنانا چاہے تو موجودہ حکومتی ڈھانچہ کے ایوان بالا (سینٹ) میں انہیں اسی طرح لایا جاسکتا ہے جس طرح ٹیکنو کریٹس کو لیا جاتا ہے۔"[1]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جمہوری طریقے سے منتخب پارلیمنٹ کے ذریعے اجتماعی اجتہاد کا تصور اسلام کی روح کے منافی ہے۔ البتہ علماء، فقہاء اور ماہرینِ فن پر مشتمل ایک ایسے ادارے کو اجتماعی اجتہاد کا فریضہ سونپا جاسکتا ہے جو علم، عدالت، فقاہت اور صلاحیت کی اسلامی بنیادوں پر پورا اترتا ہو۔ پھر چاہے اس ادارے کو پارلیمنٹ کہہ لیں یا سینٹ، مجلس اہل حل و عقد کا نام دے لیں یا مجلس شوریٰ کا، اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔

خلاصہ کلام

پارلیمنٹ کے ذریعے اجتماعی اجتہاد کا تصور اس اعتبار سے ناقص ہے کہ پارلیمنٹ کا ادارہ کوئی علمی اور فقہی مجلس نہیں ہے کہ وہ اجتہاد کا فریضہ سرانجام دے بلکہ وہ ایک ایسی سیاسی اور ملی مجلس ہے کہ جس کے قیام کا بنیادی مقصد ریاست کے انتظامی، معاشی اور سیاسی امور کی دیکھ بھال ہے۔ پارلیمنٹ کے اراکین کی اکثریت دینی علوم کی مبادیات سے بھی نابلد ہوتی ہے جبکہ اجتہاد کی بنیادی شرائط میں یہ شامل ہے کہ دینی علوم میں رسوخ حاصل ہو۔ اجتماعی اجتہاد کی بہترین صورت یہی ہے کہ جید علماء کی ایک غیر سرکاری مجلس شوریٰ ہو کہ جس میں کسی نئے مسئلے پر باہمی مشاورت کی روشنی میں ایک اجتماعی رائے کا اظہار کیا جائے اور جن علماء کا اختلاف ہو، ان کے اختلافی نکات کو بھی اجتماعی فتویٰ کے ساتھ شائع کیا جائے۔

[1] تعبیر شریعت اور پارلیمنٹ: ص 58-59